ہلالِ جرأت

عمیرہ احمد

ہلالِ جرأت

میں نے اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے ان میں اترنے والی نیند کو بھگانے کی کوشش کی...... پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے میں سو نہیں سکا تھا اور اگلے کتنے گھنٹے مجھے اسی طرح جاگتے رہنا تھا۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا...... باہر گرتی ہوئی برف نے رات ہونے سے پہلے ہی ہر چیز کو مفلوج کر دیا تھا...... ہر چیز کو مفلوج؟
نیند نے واقعی میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا ہے...... یہاں کون سی چیز ہے جو مفلوج ہو سکتی ہے؟ مردہ پہاڑوں کی مردہ چوٹیاں......؟ گہری کھائیاں......؟ ٹنوں کے حساب سے پڑی ہوئی برف......؟ صدیوں سے یہیں پڑے ہوئے چٹانوں کے یہ ٹکڑے...... یا آمنے سامنے اونچے نیچے چوٹیوں پر موجود ان چوکیوں اور بنکرز کے اندر حشرات کی طرح رینگنے والے میرے جیسے چند انسان؟
میں نے بسکٹ کے ڈبے میں موجود آخری سیلن زدہ بسکٹ کو پانی کے چند یخ قطروں کے ساتھ اپنے حلق کے اندر اتار لیا...... بنکر میں موجود خوراک کا ذخیرہ اب ختم ہو چکا تھا...... اڑتالیس گھنٹوں میں ہر دو گھنٹوں کے بعد میں نے چار بسکٹ اور پانی کے چھ گھونٹ پیئے تھے۔
چھیانوے بسکٹ اور پانی کے ایک سو چوالیس گھونٹ...... مجھے اپنے حساب کتاب پر ہنسی آ رہی تھی۔ زندگی میں پہلے کبھی ان دونوں چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے گننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کوئی بھی نہیں کرتا...... اور اب یہاں بیٹھ کر یہ کام کر رہا ہوں تو شاید وقت بھی کاٹنا چاہ رہا ہوں۔
موسم ابھی تک ویسا ہی ہے جیسا پچھلے دو دن سے تھا...... تیز ہواؤں کے ساتھ برف باری ہو رہی ہے...... اور اس کا سلسلہ کب رکے گا یہ کوئی نہیں جانتا...... دو گھنٹے کے بعد میں کیا کھاؤں گا......؟ پانی کا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں...... برف لے کر پگھلائی جا سکتی ہے یا پھر ایسے ہی چوس لوں گا یا چوسنے کی کوشش کروں گا۔ اگر میری زبان کا درجہ حرارت برف کے درجہ حرارت سے زیادہ ہوا تو برف پگھل جائے گی...... (میری سینس آف ہیومر یہاں بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑ رہی۔)
بعض دفعہ یہاں کی سردی سے مجھے یوں ہی محسوس ہوتا ہے جیسے میرے جسم کا درجہ حرارت بھی اب مائنس

10 ڈگری سینٹی گریڈ رہنے لگا ہے..... (سینس آف ہیومر)......

اڑتالیس گھنٹے پہلے یہاں صرف بسکٹ اور پانی ہی نہیں اور بھی بہت کچھ تھا...... گوشت کے نمکین سوکھے ہوئے ٹکڑے..... خشک میوہ..... خشک بھنے ہوئے چنے...... اس وقت موسم خراب نہیں تھا ورنہ میں اس کی بھی راشن بندی کر لیتا...... اور انھیں اس طرح اکٹھا نہ کھاتا..... گوشت کے ٹکڑوں کا ذائقہ تو میں ابھی تک محسوس کر رہا ہوں، حالانکہ انھیں کھائے اڑتالیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ پہلی دفعہ انھیں اس طرح کھانے کا اتفاق ہوا ورنہ میں انھیں پکا کر استعمال کرتا تھا.....اور انھیں چباتے رہنے سے مجھے دانتوں تلے پسینہ آ گیا اور پھر ان میں موجود نمک، میں نے پھر بھی انھیں کھا ہی لیا۔ وہ بالکل ربڑ کی طرح تھے...... چباتے جاؤ..... چباتے جاؤ..... مگر ٹوٹنا مشکل ہو جاتا ہے مگر جب تک وہ میرے منہ میں تھے، مجھے بڑی تقویت مل رہی تھی یوں جیسے خوراک کا ایک بڑا ذخیرہ میرے پاس تھا۔

فضا میں ایک بار پھر وہی آوازیں گونجنے لگی ہیں...... غصے کی ایک لہر سی جیسے میرے اندر اٹھی تھی...... ان کمینوں نے پھر شیلنگ شروع کر دی تھی میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی...... درد کی ایک ٹیس میرے ہاتھ میں اٹھی مگر میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

مشین گن میں کچھ دیر پہلے میں نے نیا راؤنڈ ڈالا تھا...... پچھلے دو گھنٹے میں، میں نے تین بار وقفے وقفے سے ان کی شیلنگ کے جواب میں فائرنگ کی ہے..... شیلنگ کے جواب میں فائرنگ......؟ شیلنگ کے جواب میں شیلنگ کرنے کے لیے میرے ساتھ کسی کا ہونا ضروری ہے اور میں یہاں اکیلا ہوں۔

اسلحہ بھی بڑی احتیاط سے استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ پتا نہیں اب کتنے راؤنڈز باقی رہ گئے ہیں...... بائیں ہاتھ میں اٹھنے والی ٹیسوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے بائیں بازو اور دائیں ہاتھ کی مدد سے باقی ماندہ راؤنڈ بھی فائر کر دیا۔ دوسری طرف اب خاموشی چھا گئی ہے۔

پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے یہی ہو رہا ہے۔ وہ فائر کرتے ہیں یا شیلنگ کرتے ہیں...... پھر میں فائر کرتا ہوں پھر وہ فائر بند کر دیتے ہیں۔ پھر میں فائر بند کر دیتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ شیلنگ یا فائرنگ کر کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔

''کوئی ہے؟ Knock Knock'' اور میں جواباً فائرنگ کرتے ہوئے کہتا ہوں۔

''ہاں ابھی میں ہوں۔'' وہ فائرنگ بند کر دیتے ہیں۔

''اچھا ٹھیک ہے پھر آئیں گے۔''

میں بھی فائرنگ بند کر دیتا ہوں۔ "Anytime"

میں مشین گن سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ہاتھ میں اٹھنے والی ٹیسیں ایک بار پھر مجھے کراہنے پر مجبور کر رہی ہیں۔

دو دن پہلے اس ہاتھ پر گولی لگی تھی...... اس وقت جب میں باہر اپنے کچھ جوانوں کے ساتھ تھا...... مجھے دو گولیاں لگی تھیں ایک ماتھے سے رگڑ کھاتے اور میرا گوشت اڑاتے ہوئے گزر گئی۔ دوسری ابھی بھی میرے ہاتھ میں موجود ہے میں خوش قسمت تھا...... سات آدمیوں میں سے بچنے والا میں واحد آدمی تھا...... یا پھر بدقسمت تھا، سات آدمیوں میں سے شہادت کا رتبہ نہ پانے والا واحد آدمی تھا۔

واپس اندر آ کر میں نے اپنی مرہم پٹی کرنے کی کوشش کی۔ ماتھے سے نکلنے والا خون کچھ دیر کے بعد رک گیا تھا۔ وہ خطرناک نہیں تھا...... مگر ہاتھ میں موجود گولی...... تب مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ اگلے دو دن یہاں سے نیچے جانے کے بجائے مجھے یہیں گزارنے پڑیں گے۔

اب ہاتھ کی حالت دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ اسے کاٹنا پڑے گا مگر کتنا...... ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ صرف ہاتھ ہی کاٹنا پڑے گا یا...... اور بھی کچھ......

مجھے اپنی منگیتر زینب کا خیال آ رہا تھا...... اسے میرے ہاتھ بڑے پسند تھے۔

''ولید تمہارے ہاتھ تو مردانہ ہاتھ لگتے ہی نہیں اور فوجیوں کے ہاتھوں جیسے تو بالکل بھی نہیں...... اتنے نازک اور نفیس ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے میں بعض دفعہ ان پر کیوٹکس لگا کر دیکھوں کہ وہ کیسے لگتے ہیں۔'' وہ اکثر مذاق میں مجھے چھیڑتی تھی۔

اب اس وقت وہ اس ہاتھ کو دیکھ لے تو......؟ میں سوچ رہا ہوں کٹوانے کے بعد یہ ہاتھ اسے بھجوا دوں...... بذریعہ کوریئر سروس...... شاید ایسی بات اس کے سامنے کہوں تو......

''تمہارے پریکٹیکل جوکس کب ختم ہوں گے ولید......؟ بڑے ہو جاؤ اب۔'' وہ یقیناً مجھ پر چلائے گی اگر روئی نہ تو...... (میرا اسپیس آف ہیومر۔)

میری کزن ہے وہ...... خالہ زاد کزن...... منگیتر بنے تو ابھی اسے صرف دو سال ہی ہوئے ہیں اور بیوہ بننے میں بس دو دن اور لگیں گے، اگر یہ برف باری اسی طرح جاری رہی اور نیچے بیس کیمپ سے کوئی نہ آیا تو...... یہاں ہزاروں فٹ کی بلندی پر کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات کس طرح گزارے گا...... جیسے میں اس وقت اندازہ نہیں کر پا رہا۔

مگر کوئی بات نہیں اگر وہ چھ آدمی برف کا کفن اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے یہاں دفن ہو سکتے ہیں...... اگر سامنے اونچائی پر موجود چوکیوں میں بیٹھے ہوئے دشمن کے فوجی بھی اسی برف باری، اسی طوفان، اسی تنہائی اور ان ہی کھائیوں اور چوٹیوں کے ساتھ یہاں بیٹھے لڑ سکتے ہیں تو میں بھی لڑ سکتا ہوں...... اگر وہ مٹی کے لیے خون دے سکتے ہیں تو میں بھی دے سکتا ہوں......

''آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑیں گے۔''

مجھے پی ایم اے میں بار بار دہرایا ہوا سبق یاد آنے لگا...... میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آخری آدمی۔''

''آخری گولی۔'' آج پہلی بار ان دونوں چیزوں کی اہمیت اور صحیح مفہوم سمجھ میں آیا تھا...... میں نے مشین گن کے باقی راؤنڈز کو دیکھنا شروع کر دیا...... آخری آدمی، آخری گولیاں گن رہا تھا۔

اڑتالیس گھنٹے پہلے میں یہاں اس طرح اکیلا نہیں تھا، میرے چھ ساتھی میرے ساتھ تھے...... مگر اب میں یہاں اکیلا بیٹھا ہوں...... وہ چھ کے چھ باہر ہیں...... پتا نہیں، اتنی برف میں سے ان کی لاشیں نکل بھی سکیں گی یا

نہیں...... میں نے آنکھیں بند کر کے ایک بار پھر اس جگہ کے محل وقوع کو اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کی جہاں ان کی لاشیں تھیں...... دو دن کی اس برف باری نے ہر چیز کو خاصا بدل دیا ہوگا...... پھر برف کی تہ در تہ...... میں نے مایوسی سے سر ہلایا...... شاید ان کی قسمت میں برف کی قبر ہی تھی...... اور شاید میری قسمت میں بھی۔

دو دن پہلے کیا ہوا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا...... دو ساتھی باہر گئے تھے...... وہ بہت دیر کے بعد واپس آئے اور انھوں نے بتایا کہ انھوں نے چوکی سے باہر کچھ فاصلے پر نقل و حرکت دیکھی تھی۔ ہم لوگ یک دم چوکنے ہو گئے۔

پچھلے ماہ ہماری دو چوکیوں پر بھارتی فوجیوں نے حملہ کیا تھا۔ ایک چوکی پر انھوں نے قبضہ کر لیا اور ہم اسے واپس لینے میں ناکام رہے۔ دوسری چوکی والوں نے انھیں پسپا کر دیا...... اور اب یقیناً ہماری باری تھی۔

ہم نے اگلو (igloo) میں موجود ساتھیوں کو بھی بلوا لیا...... ایک ساتھی کو بنکر کے اندر چھوڑ کر ہم سب باہر نکل گئے۔ وہیں جہاں نقل و حرکت دیکھی گئی تھی۔ وہاں واقعی کچھ لوگ تھے اور وہ ہماری ہی طرف آ رہے تھے...... نہ صرف آ رہے تھے بلکہ ان میں سے کچھ خاصی اہم جگہوں پر پہنچ چکے تھے اور وہ اب یقیناً ہم پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ہم جس حد تک لڑ سکتے تھے لڑے...... اندر بنکر میں موجود ساتھی بھی کچھ دیر بعد باہر ہمارے ساتھ آ گیا۔

ہم نے حملہ پسپا کر دیا مگر حملے میں میرے سارے ساتھی مارے گئے اور خود میں زخمی ہو گیا اور میں یہاں آ گیا۔ وائرلیس پر میں نے بیس کیمپ کو حملے اور ہونے والے جانی نقصان کی اطلاعات کوڈ ورڈز میں دی...... کیونکہ وائرلیس کی ٹرانسمیشن اکثر بھارتی فوجی درمیان میں سنتے رہتے تھے۔ میں نے انھیں کچھ اور لوگوں کو بھیجنے کے لیے کہا...... مگر پھر یک دم موسم خراب ہونا شروع ہو گیا...... اور مجھے بتایا گیا کہ ابھی کسی کو روانہ نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے خطرہ تھا کہ بھارتی فوجی کہیں دوبارہ حملہ نہ کر دیں...... اگرچہ پہلے حملے میں انھیں بھی خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا مگر دوسرا حملہ کرنے پر تو انھیں میدان صاف ملتا۔ کسی قسم کی کوئی مزاحمت درپیش نہ آتی۔ مگر انھوں نے دوبارہ حملہ نہیں کیا۔ میری چوکی پر وقفے وقفے سے شدید شیلنگ اور فائرنگ کی گئی...... شاید انھیں بھی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمیں خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے...... اور وہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ ابھی چوکی میں کتنے لوگ موجود ہیں...... کوئی ہے بھی یا نہیں۔ جواباً شیلنگ نہ ہونے سے انھیں ہماری افرادی قوت کا تو پتا چل ہی گیا ہوگا مگر فائرنگ ہونے سے انھیں یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ابھی مزاحمت ہو سکتی ہے۔

پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے میں وقفے وقفے سے فائرنگ کرتے ہوئے انھیں یہی بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ چوکی ابھی مکمل طور پر خالی نہیں ہوئی۔ ابھی وہاں کوئی نہ کوئی ہے...... اور وائرلیس پر بیس کیمپ سے رابطہ قائم کرتے ہوئے بھی میں آوازیں بدل بدل کر اپنے ساتھیوں کے نام استعمال کر رہا تھا تاکہ اگر ٹرانسمیشن کسی بھی طرح درمیان میں سن لی جائے تو وہ یہی سمجھیں کہ چوکی میں ابھی خاصے لوگ ہیں اور دوسرے حملے کا نہ سوچیں۔

ایک دوسرے پر فائرنگ اور شیلنگ کرتے ہوئے ہم پاگل لگتے ہیں...... نہ انھیں ہم نظر آتے ہیں نہ ہمیں وہ...... یہ سرحدی یا میدانی علاقہ تو نہیں کہ فوجی آمنے سامنے بیٹھے نظر آئیں...... بعض دفعہ تو یوں لگتا ہے جیسے فوجی اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے اس طرح اندھا دھند گولیوں کا استعمال کر رہے ہیں...... ہو سکتا ہے ان کی چوکی میں بھی اب

چند ہی لوگ موجود ہوں اور ان میں سے بھی کچھ میری طرح زخمی ہوں...... اور شاید ان کے فوری طور پر دوبارہ حملہ کرنے کی وجہ بھی یہی ہو۔ میرے قیافے اور اندازے جاری ہیں...... پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں یہاں اکیلا بیٹھا میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟

دو دن پہلے سپلائی آنی تھی...... نہیں آ سکی...... اور مجھے ابھی یہاں آئے صرف چھ ہفتے ہی ہوئے ہیں...... چھ ہفتے میں ہی میں بہت کچھ سیکھ گیا ہوں...... آج سالگرہ بھی تھی میری...... چھ ستمبر کے دن ہوتی ہے میری سالگرہ...... پی ایم اے میں میرا مذاق اڑایا جاتا تھا۔

''تمہاری پیدائش ہی وطن کے دفاع کے لیے ہوئی ہے۔'' میرے ایک انسٹرکٹر نے ایک بار مجھ سے کہا تھا اور آج یہاں بیٹھا میں سوچ رہا ہوں کہ بعض باتیں کتنی سچی ہوتی ہیں۔

کچھ دیر پہلے میں نے اپنی سالگرہ کے دن سے ایک ہفتہ پہلے ملنے والے وہ سارے کارڈز اور خط دیکھے ہیں جو میرے گھر والوں اور زینب نے بھجوائے ہیں۔ میری بہن نے کارڈ میں لکھا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ میری عمر کم از کم دو سو سال ہو تاکہ میں اگلے دو سو سال اسے اس کی دوستوں کے گھر لے جاتا رہوں...... دو سو سال......؟

میرے چھوٹے بھائی نے مجھے کارڈ میں لکھا تھا کہ وہ میری واپسی کا بڑی شدت سے انتظار کر رہا ہے...... پچھلی دفعہ ایک اوور میں اس نے مجھے چودہ بار آؤٹ کیا تھا...... اس کا اصرار تھا کہ یہ ورلڈ ریکارڈ ہے۔ میرا کہنا تھا کہ یقیناً ورلڈ ریکارڈ ہے مگر ایک اوور میں چودہ بار آؤٹ کرنے کا نہیں بلکہ ایک اوور میں چونتیس نو بال کروانے کا...... تیرہ بار میں نو بال پر آؤٹ ہوا تھا...... صرف ایک بار صحیح بال پر اور وہ بھی اپنی غلطی کی وجہ سے ورنہ اس میں باؤلر کا کوئی کمال نہیں تھا۔ اس بار اس نے مجھے کارڈ کے ساتھ اپنے خط میں لکھا ہے کہ اس بار اس نے نئے اسپائکس خریدے ہیں اور وہ اس بار اپنے دس اوور کے سپیل میں ایک بھی نو بال نہیں دے گا۔

شاید اس بار یہاں سے واپسی پر اس کی ضرورت ہی نہ پڑے...... میں نے خون آلود دستانے میں لپٹے ہوئے اپنے سوجے ہوئے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

میری امی نے بھی مجھے اپنے خط میں بہت سی دعائیں بھیجی تھیں۔

''میرا دل آج کل بہت گھبرا رہا ہے...... ہر وقت تمہارا خیال آتا رہتا ہے۔ اپنا خیال رکھنا بیٹا۔''

انھوں نے تین صفحے کے خط میں پندرہ بار مجھے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی...... میری آنکھوں میں نمی اترنے لگی...... ان کا خط پڑھتے ہوئے میں اسی طرح آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ ماؤں کو ہر بات کا پہلے سے پتا کیوں چل جاتا ہے؟

بابا کے خط میں ہمیشہ کی طرح نصیحتیں تھیں:

''تم کو یاد رکھنا چاہیے کہ تم ایک فوجی ہو...... فوجی کا کام اپنے کام میں excel کرنا ہوتا ہے...... ولید زماں میں چاہتا ہوں سیاچن سے واپسی پر تمھارے سینے پر کم از کم ایک میڈل ضرور ہو۔''

انھوں نے خط میں لکھا تھا...... کئی دن پہلے خط پڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ بہت مشکل ہے۔ آخر

یہاں میں ایسا کر کیا سکتا تھا کہ ایک میڈل کا حق دار کہلاتا...... مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ اگر یہ چوکی بچ گئی...... اور کمک جلد پہنچ گئی تو ایک میڈل میرے سینے پر لگ ہی جائے گا...... نشانِ حیدر نہ سہی...... ہلالِ جرات سہی۔

زینب کا کارڈ ہمیشہ کی طرح گلاب کے سرخ پھولوں سے بھرا ہوا تھا...... سرخ گلاب...... اس کی زندگی میں پھول نہ ہوں تو کچھ بھی نہیں ہوتا...... سویٹ پی اور سرخ گلاب...... وہ یکم ستمبر کو اسی سال پیدا ہوئی تھی جس سال میں پیدا ہوا تھا...... اور منگنی سے پہلے تک وہ شدید غصے میں آ جاتی تھی جب میں اسے سب لوگوں کے درمیان زینب آپا کہا کرتا تھا۔

"Behave yourself ولید! تمھیں شرم نہیں آتی مجھے آپا کہتے ہوئے۔" اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا، وہ غراتی۔

"اس میں شرم والی کیا بات ہے؟ میں تو آپ کا احترام کر رہا ہوں زینب آپا۔" میں بظاہر سنجیدگی سے کہتا۔

"تم اپنا احترام اپنے پاس رکھو...... پانچ دن کا فرق مجھے تمہاری آپا نہیں بنا دیتا...... سمجھے تم؟"

"بندے کو حساب کتاب میں صاف رہنا چاہیے۔ اب چاہے کوئی ایک دن بڑا ہو یا ایک منٹ...... بڑا تو بڑا ہی ہوتا ہے زینب آپا......" میں ڈھٹائی سے "آپا" پر زور دیتا۔

"تمہارا حساب اتنا اچھا ہوتا تو تم فوج میں نہ ہوتے انجینئرنگ یونیورسٹی میں بیٹھے ہوتے میرٹ لسٹ پر آ کر۔" وہ مجھ پر چوٹ کرتی۔

"آپا! وہ اور بات ہے۔" میں ایک بار پھر آپا پر زور دیتے ہوئے کہتا۔

"دفع ہو جاؤ تم۔ ولید! تم بہت ہی mean انسان ہو۔" وہ ہتھے سے اکھڑ جاتی۔

"اس بار میں کوئی لحاظ نہیں کروں گی کہ تم یہاں بیٹھے ہو...... ملازم سے کہہ کر دھکے دے کر نکلوا دوں گی تمھیں اگر اب مجھے آپا کہا تو۔" میں جانتا تھا، اس بار یہ دھمکی نہیں تھی، وہ تین بار اسی طرح مجھے گھر سے نکلوا چکی تھی...... میں نے اسے آپا کہنا چھوڑ دیا...... میں اسے باجی کہنے لگا۔

اس کے باوجود اس کے ساتھ میری دوستی ختم نہیں ہوئی...... ہم بچپن میں ہزاروں نہیں تو سینکڑوں بار ایک دوسرے کی ٹھکائی کر چکے تھے...... قریب گھر ہونے کا یہ نقصان تھا۔ میں اس کے بھائیوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور میرا زیادہ وقت اس کے گھر پر ہی گزرتا تھا...... اس کے بھائیوں کے ساتھ میری بڑی دوستی تھی۔ زینب کے ساتھ بھی تھی مگر اس سے جھگڑا زیادہ ہوتا تھا۔

منگنی ہم دونوں کے کہنے پر ہی ہوئی تھی۔ اب اس میں محبت کے عنصر کا کتنا دخل تھا۔ پتا نہیں...... میں بہت دیر تک سرخ گلابوں والے اس میوزیکل کارڈ کو کھولے بیٹھا رہا......

"آخر تمھیں ہی کیوں بھیج رہے ہیں سیاچن...... اور بھی تو لوگ ہیں؟" یہاں پوسٹ ہونے سے پہلے اس کی بچکانہ بات سن کر مجھے بڑی ہنسی آئی تھی۔

"میں ان سے کہہ دیتا ہوں میرے بجائے زینب جواد کو سیاچن بھجوا دیں۔ ٹھیک ہے؟" وہ میری بات پر

ہنسنے کے بجائے رونے لگی۔

"تم سے کتنا کہا تھا ایف ایس سی کے دوران کہ محنت کرو...... پڑھو، نمبر لے لو...... تا کہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہو جائے مگر تم نے......" وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ مجھے اس کی بات پر اور ہنسی آئی۔

ہاتھ میں یک دم پھر ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

..........۞..........

چھ ستمبر کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان کی طرف سے منعقد کیے جانے والے شو کی تیاریاں اپنے پورے عروج پر تھیں۔ اس شو کو براہِ راست براڈ کاسٹ کیا جانا تھا اور مہمانوں میں جہاں فوج میں مختلف خدمات سرانجام دینے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، وہاں سنگرز بھی تھے۔

ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جو مختلف جنگوں میں دادِ شجاعت دینے والے ہیروز کی وجہ سے کم اور نوجوان نسل کے نمائندہ گلوکاروں کو سننے کے لیے زیادہ جمع تھے۔

سب لوگ اپنی سیٹوں پر براجمان ہو چکے تھے۔

کمپیئر ایک بار پھر اسٹیج پر چڑھ کر اپنی لائنز کی ریہرسل کر رہا تھا۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ گونجنے والی واحد آواز کمپیئر کی تھی جو چھ ستمبر کے حوالے سے اپنی لائنز کو بڑے پر اعتماد انداز میں دہرا رہا تھا...... اس کی ساتھی کمپیئر مسکراتے ہوئے حاضرین کو دیکھ رہی تھی۔

..........۞..........

صوبیدار (ریٹائرڈ) کریم بخش نے آٹھویں رو کی دسویں نشست پر بیٹھے ہوئے ایک بار سر اٹھا کر اسٹیج پر موجود روشنیوں کو دیکھا...... اور اسے اپنا گلا خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا...... زندگی میں پہلی بار وہ اس طرح کے کسی شو میں شرکت کر رہا تھا اور وہ گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کی گھبراہٹ یہ سوچ کر اور بڑھتی جا رہی تھی کہ کچھ دیر کے بعد وہ خود اس اسٹیج پر موجود ہوگا اور اسی کمپیئر سے بات کر رہا ہوگا۔ جو اس وقت بڑے فراٹے کے ساتھ رٹے رٹائے جملے ادا کر رہا تھا۔

کریم بخش نے اپنے سر پر موجود قراقلی ٹوپی کو ہاتھ سے درست کیا اور پہنی ہوئی واسکٹ پر لگے ہوئے ایک اکلوتے تمغے پر فخریہ نظر ڈالی۔

وہ زندگی میں ان تمام مواقع کو انگلیوں پر گن سکتا تھا جب اس نے یہ قراقلی ٹوپی اور واسکٹ پہنی تھی...... پہلا موقع وہ تھا جب اس نے اس میڈل کو وصول کرنے کے بعد صدر کی طرف سے دیے جانے والے ایک عشائیے میں شرکت کی تھی...... دوسرا موقع وہ تھا جب اس کے بیٹے کی شادی ہوئی تھی اور تیسرا موقع آج آیا تھا...... واسکٹ اور قراقلی ٹوپی میں سے اب بھی تمباکو کی بو آ رہی تھی جو ان کپڑوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس صندوق میں رکھا ہوا تھا جس میں یہ کپڑے رکھے تھے۔

ایک گہرا سانس لے کر اس نے اس گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی جس کا وہ شکار ہو رہا تھا...... سر اٹھا کر

اس نے اسٹیج پر لگی ہوئی ان دس تصویروں پر نظر دوڑائی جنھیں نشانِ حیدر مل چکا تھا...... پھر اس کی نظر اس کونے میں گئی جہاں تینوں افواج کے جھنڈے موجود تھے، اس نے اگلی نظر اپنے اردگرد موجود لوگوں پر ڈالی۔ وہ سب اسی کی طرح کے چھوٹے رینک کے فوجی تھے جنھیں مختلف جھڑپوں میں مختلف امتیازی کارناموں پر میڈلز دیے جا چکے تھے اور وہ سب اس کی طرح گھبراہٹ کا شکار تھے۔ وہ ان میں سے کچھ کو ذاتی طور پر جانتا تھا...... کئی سال پہلے ان میں سے کچھ اسی کی یونٹ کا حصہ تھے اور کئی کے ساتھ اس نے مختلف قسم کی مشقوں میں حصہ لیا تھا اور کئی کے بارے میں اس نے مختلف حوالوں سے مختلف لوگوں سے سنا تھا...... مگر آج پہلی بار انھیں دیکھ رہا تھا اور آج پہلی بار ایک چھت کے نیچے ان سے مل رہا تھا۔

مگر اس کے باوجود اس کی گھبراہٹ ان لوگوں کی مرہونِ منت نہیں تھی...... یہ ان لوگوں کے چہرے کے تاثرات اور جسم کی حرکات نہیں تھیں جو اس کے لیے گھبراہٹ یا پریشانی کا باعث بن رہی تھیں...... بلکہ وہاں ان کے ساتھ بیٹھے اسے کچھ حوصلہ محسوس ہو رہا تھا...... شاید وہ لوگ وہاں نہ ہوتے تو وہ اس ہال سے بھاگ ہی جاتا۔ اس نے ایک بار پھر ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اسٹیج کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی نظریں روشنیوں سے چکا چوند ہو گئیں۔
ہال میں اب پروگرام کا باقاعدہ آغاز ہونے والا تھا...... فائنل کیو دی جا رہی تھی۔ کریم بخش نے ایک گہرا سانس لے کر ایک بار پھر سر اٹھایا۔

............❀............

میں نے پاس پڑے ریڈیو کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وائرلیس کے علاوہ بیرونی دنیا سے ہمارے رابطے کا یہ واحد ذریعہ تھا۔ بعض دفعہ کوئی اسٹیشن ٹیون اِن کرتے ہوئے دوسری طرف کے فوجیوں کی فریکوئنسی مل جاتی۔ بعض دفعہ ان کی گفتگو عام ہوتی...... بعض دفعہ وہ بھی کوڈ ورڈز میں بات کر رہے ہوتے...... اور یہاں چوکی میں بیٹھے ہوئے لوگ ان کوڈ ورڈز کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہتے...... یہ جیسے ہمارے لیے تفریح کا ایک ذریعہ بن جاتا تھا۔
میں جانتا تھا آج چھ ستمبر کی مناسبت سے ریڈیو پر بہت سے پروگرامز اور گیت نشر ہو رہے ہوں گے۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں میں بار بار ریڈیو آن آف کرتا رہا تھا...... کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا اس کی بیٹریز ڈاؤن ہو جائیں اور میں ان واحد انسانی آوازوں سے بھی محروم ہو جاؤں...... جنھوں نے اس تنہائی اور تکلیف میں بھی مجھے اپنے ہوش و حواس میں رکھا ہوا تھا۔

''خواتین و حضرات! میں آپ کو ریڈیو پاکستان کی طرف سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کی خاص تقریب پاک فوج کے ان جوانوں کے کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے منعقد کی جا رہی ہے جو سرزمین پاک کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے پر یقین رکھتے ہیں۔'' بے مقصد ٹیوننگ کرتے ہوئے ایک اسٹیشن سے آنے والی صاف آواز اور الفاظ نے مجھے روک لیا۔

''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آج کو ہمارے کل کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔'' میرے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھری۔ ہاتھ میں ابھرنے والی ٹیسیں یک دم کچھ مدھم ہونے لگیں۔

''یہ قوم سے کہتے ہیں کہ تم سو جاؤ کیونکہ بارڈرز پر ہم ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر باہر جھانک کر دیکھا۔ برف باری ابھی نہیں تھمی تھی اور میرے لیے اگر یہ برف باری پریشانی کا باعث تھی تو دوسری طرف ایک حفاظتی دیوار کا کام بھی کر رہی تھی۔

میں جانتا تھا، بھارتی فوجی برف باری اور تاریکی میں میری چوکی پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ اگر وہ ایسی کوشش کرتے تو برف اور کھائیاں انھیں مجھ تک پہنچنے نہ دیتیں۔

''اور اگر کوئی دشمن ہماری مٹی کی طرف بڑھنے کی جرأت کرے گا تو ہم لڑیں گے اس وقت تک جب تک کہ ہماری رگوں میں خون کا آخری قطرہ موجود ہے...... اس وقت تک جب تک ہمارے وجود میں زندگی کی آخری رمق موجود ہے۔''

کمپیئر ایک بار پھر کہہ رہا تھا...... اس بار اس کی آواز ہال میں ابھرنے والی تالیوں کے شور میں بری طرح دب گئی تھی۔ لوگ یقیناً اس کے جملوں سے محظوظ ہوئے تھے...... تالیوں کا شور ابھی تک سنائی دے رہا تھا...... کمپیئر اب خاموش ہو کر تالیوں کے تھمنے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے اپنی رائفل کو ایک بار پھر نئے سرے سے لوڈ کیا۔ اگرچہ اس وقت میں اسے استعمال نہیں کر پا رہا تھا اور شاید اس مقابلے میں اس کی ضرورت ہی نہ پڑتی کیونکہ وہ لوگ اگر اس چوکی تک پہنچ جاتے اور انھیں رستے میں کہیں نہ روکا جاتا تو وہ اس چوکی کو مجھ سمیت اڑا دیتے...... مگر میں نے پھر بھی ایک بار رائفل کو نئے سرے سے لوڈ کیا۔

''زندہ قومیں اپنے غازیوں اور شہیدوں کو فراموش نہیں کرتیں...... زندہ قومیں اپنے غازیوں اور شہیدوں کے خون کے ان قطروں کا احترام کرتی ہیں جو وہ اس مٹی کے دفاع کے لیے بہاتے ہیں...... اور آج اس ہال میں ہم آپ کو ایسے ہی کچھ لوگوں سے ملوائیں گے جن کی قوم احسان مند ہے۔''

میں نے اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں جسم کو تھوڑا سا سکون ملا...... میں ایک بار پھر گود میں رکھے ہوئے اس ریڈیو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ برف باری کے باوجود حیرت انگیز طور پر آواز بہت صاف تھی...... مگر یہاں اکثر ایسے عجیب واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

''میں سب سے پہلے اپنے پہلے مہمان کو بلواتا ہوں جن کا تعلق پاکستان ایئر فورس سے ہے...... 1965ء کی جنگ میں انھیں دشمن کے دو جہاز مار گرانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ میں دعوت دیتا ہوں۔''

میری توجہ اچانک باہر مرکوز ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا تھا، برف باری رک گئی تھی...... میری حسیات یک دم جیسے بیدار ہو گئی تھیں۔ میں اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے دائیں ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کھڑا ہو گیا...... اگر برف باری واقعی رک گئی تھی تو ایک بار باہر کا جائزہ لینا ضروری ہو گیا تھا۔

مجھے موسم کا اندازہ لگانا تھا۔ کیا اس وقت ہیلی کاپٹر کی کوئی فلائٹ ممکن تھی...... اگر برف باری اگلے کئی گھنٹے رکی رہی تو دشمن کا دوسرا حملہ بھی ہو سکتا تھا۔

ان کی حکمت عملی کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا تھا مگر یہ ضرور اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اس چوکی کو حاصل

کرنے کے لیے بے خوف تھے...... یہ اندازہ تو انھیں ہو ہی چکا ہوگا کہ پہلے حملے میں ہمارا جانی نقصان ہوا ہے کیونکہ انھوں نے ہمارے جوانوں کی لاشیں دیکھ لی ہوں گی اور وہ فوجی جو پسپا ہونے کے بعد واپس چلے گئے تھے انھوں نے یقیناً اس بات کی خبر آگے دی ہوگی...... اب چوکی میں کتنے آدمی موجود ہیں...... اس کا انھیں حتمی اندازہ نہیں ہوگا...... لیکن اگر وہ ہماری لاشیں گن گئے تھے تو وہ جانتے ہوں گے کہ اب چوکی میں دو چار سے زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔

اگرچہ میں نے وائرلیس پر بار بار گفتگو کے درمیان دو تین مختلف آوازوں اور لہجوں میں بات کی...... مگر گفتگو درمیان میں سننے والے لوگ کتنے بے وقوف یا کتنے ہوشیار تھے، اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا...... یہ بات یقیناً وہ بھی جانتے ہوں گے کہ چوکی پر ابھی تک کوئی کمک نہیں پہنچی کیونکہ موسم نے ایسی کسی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا...... اور اب برف باری رک جانے پر وہ اندھیرے میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دوسرے حملے کا بھی سوچ سکتے تھے۔ ایک بار باہر جانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے اپنے ہوش و حواس کو بحال رکھنے کی کوشش کی اور لڑکھڑاتے قدموں سے آہستہ آہستہ باہر نکل گیا...... سردی کی ایک لہر نے مجھے یخ کر دیا تھا۔ اندر اور باہر کے درجہ حرارت میں اس وقت زمین آسمان کا فرق تھا...... میرے دانت بجنے لگے تھے، میں نے اپنے چہرے کے ٹوپی سے باہر رہ جانے والے تھوڑے سے حصے کو ہاتھ سے ڈھک لیا۔ وہاں قبر جیسی تاریکی اور ٹھنڈک تھی اور آسمان سے گرنے والی برف اب واقعی مکمل طور پر بند ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ بھی آہستہ آہستہ دم توڑ رہے تھے۔

میں واپس اندر پلٹ آیا...... کچھ دیر بے دم سا بیٹھا میں وہاں ریڈیو پر گونجنے والی آواز کو بے مقصد سنتا رہا۔ پھر میں اٹھ کر وائرلیس کے پاس چلا گیا۔ ریڈیو کو وقتی طور پر میں نے بند کر دیا تھا...... وائرلیس کی فریکوئنسی ایڈجسٹ کرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر بیس کیمپ سے رابطہ قائم کیا۔ موسم کے ٹھیک ہونے کی خبر ان تک بھی پہنچ چکی تھی اور ایک بڑا رسک لیتے ہوئے وہ دس لوگوں کی ایک ٹیم کو رات کے اسی وقت وہاں پہنچانے کی تیاریاں کر چکے تھے۔

میں جانتا تھا، وہ دس کے دس لوگ اس وقت اس مہم پر روانہ ہوتے ہوئے اپنی جان کو داؤ پر لگائیں گے...... مگر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا...... جلد یا بدیر کسی ٹیم کو یہاں آنا ہی تھا...... اور بہتر تھا یہ ٹیم اسی وقت یہاں آ جاتی...... ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میں نڈھال ہو رہا تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ میں کس وقت اپنے ہوش و حواس کھو دوں گا...... اس وقت سے پہلے کسی کو یہاں ہونا چاہیے تھا ورنہ یہ چوکی بھی...... میں پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا مگر اس بار میں قدرے مطمئن تھا...... چند گھنٹوں کی بات تھی پھر ٹیم یہاں پہنچ جاتی...... دس لوگ نہ سہی...... ان میں سے دو چار تو یہاں پہنچ ہی جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دس کے دس ہی یہاں پہنچ جائیں...... اگر وہ بہت خوش قسمت ہوئے تو۔

میں ایک بار پھر مشین گن سے باہر فائر کرنے لگا...... یہ ضروری تھا دوسری طرف سے جواب فوراً آیا...... اس بار میں نے قدرے زیادہ دیر تک فائرنگ کی...... میرے پاس وہاں ایمونیشن کی کمی نہیں تھی...... دوسرے راؤنڈ کو فائر کرنے کے بعد میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی اور گہرے سانس لینے لگا۔

دوسری طرف ابھی بھی فائرنگ ہو رہی تھی مگر میرا اب اس فائرنگ کے جواب میں فائرنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا...... میں جانتا تھا، کچھ دیر بعد وہ بھی تھک ہار کر بیٹھ جائیں گے۔ ایک بار پھر میں نے ریڈیو

آن کر دیا۔

❀

''اب ہم آپ کی ملاقات کرواتے ہیں سیاچن کے ایک ہیرو سے۔'' میں کچھ چونک گیا۔ اپنی سماعتوں کو میں نے ریڈیو پر مرکوز کرلیا۔

''1984ء میں سیاچن پر بھارت کے قبضے کے بعد یہ ان پہلے فوجیوں میں سے ہیں جنھوں نے وہاں اپنے فرائض سرانجام دیے۔ یہ وہ فوجی ہیں جنھیں وہاں بھجواتے ہوئے اس طرح کا لباس اور ہتھیار فراہم نہیں کیے گئے تھے جو ہمارے فوجیوں کو آج سیاچن پر بھجواتے ہوئے فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان فوجیوں نے وہاں اپنی چوکیاں بھی قائم کیں اور وطن کی سرحد کا دفاع کرتے ہوئے دشمن کو پورے سیاچن پر قابض ہونے سے روکا۔''

میں بالکل خاموشی کے ساتھ ٹرانسمیشن سن رہا تھا۔

''میں دعوت دیتا ہوں صوبیدار (ریٹائرڈ) کریم بخش ستارۂ جرأت کو کہ وہ اسٹیج پر تشریف لائیں۔''

میں نہیں جانتا کہ کریم بخش سے پہلے کمپیئر کتنے مہمانوں سے گفتگو کر چکا تھا مگر ہال میں گونجنے والی تالیوں کی آواز بہت پُر جوش نہیں تھی۔

''ہمارے مہمان کو اسٹیج تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ رہا ہے کیونکہ وہ پچھلی نشستوں میں بیٹھے ہیں مگر یہ تاخیر ہمارے لیے باعث زحمت نہیں ہے۔''

کمپیئر اب کہہ رہا تھا۔ پچھلی نشستوں پر؟ اور اگلی نشستوں پر کون بیٹھا ہوگا...... میں تصور کرسکتا تھا...... جنرلز...... وزیر...... بیوروکریٹس...... میں قدرے تلخی سے مسکرایا۔

❀

کریم بخش نے یک دم چونک کر کمپیئر کو اپنا نام لیتے ہوئے سنا۔ پچھلے پون گھنٹہ میں وہ کتنے ہی لوگوں کو اسٹیج پر جاتے اور کمپیئر سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے تجربات سناتے دیکھا تھا۔ بعض کی باتوں پر اس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ بعض کی باتوں پر فخر سے اس کا سینہ تن گیا تھا...... بعض کی باتوں پر اس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ تالیاں پیٹی تھیں، اتنی تالیاں کہ اس کے ہاتھ سن سے ہوگئے تھے۔ وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ ابھی اسے بھی اسٹیج پر جانا اور پھر وہ سب کچھ دہرانا ہے جو...... اور اب کمپیئر کے نام لینے پر وہ اچانک گھبرا گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کدھر سے اسٹیج پر جائے، حالانکہ ریہرسل کے دوران اسے بھی دوسروں کے ساتھ ضروری ہدایات دی گئی تھیں۔

پھر قدرے کانپتی ہوئی ٹانگوں اور جسم کے ساتھ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اپنی رو سے نکلنے لگا...... وہ لوگوں کی اپنے چہرے پر جمی ہوئی نظریں دیکھ سکتا تھا...... اور وہ ان تالیوں کو بھی سن رہا تھا جو اس کے لیے بج رہی تھیں۔ سیڑھیاں اتر کر پہلی رو کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے لاشعوری طور پر رک کر وہاں بیٹھے ہوئے جنرلز کو سیلوٹ کیا...... ان میں سے چند نے بے تاثر چہرے اور گردن کے ایک ہلکے سے خم کے ساتھ اس کے سیلوٹ کا جواب دیا...... مگر پھر وہ وہاں رکا نہیں...... وہ اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

''کریم بخش صاحب! آپ نے سیاچن پر کافی عرصہ گزارا اور وہاں چوکی قائم کی تھی...... آپ اپنے ان تجربات سے ہمیں بھی آگاہ کریں۔'' کمپیئر کریم بخش سے گفتگو کا آغاز کر رہا تھا۔

''آپ سیاچن پر بھجوائے جانے والے پہلے فوجیوں میں سے ایک تھے...... آپ بتائیے، جب آپ وہاں پہنچے تو کیا تھا وہاں؟''

''برف۔'' کریم بخش کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ہال میں کچھ کھلکھلاہٹیں ابھریں۔ کریم بخش اب جیسے خلا میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھ رہا تھا۔

''برف......'' میں نے تھکے ہوئے انداز میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا دی...... ''ہاں برف کے علاوہ یہ اور ہے بھی کیا۔'' میں نے سوچا...... برف کا قبرستان ہے یہ وہی برف جو اس وقت میرے چھ ساتھیوں کو ڈھانپ چکی ہے۔

ریڈیو میں سے آواز نہیں آ رہی تھی۔ کریم بخش شاید کچھ اور لفظوں کی تلاش میں تھا...... یہاں موجود برف دن کی روشنی میں آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے اور رات کے اندھیرے میں ہر چیز نگل لیتی ہے...... یہاں صرف دشمن کا خوف نہیں ہوتا...... برف کا خوف بھی ہوتا ہے۔ شاید میں بھی کمپیئر کے اس سوال پر اسی طرح ایک لفظ بول کر گونگا ہو جاتا۔ میں انتظار کر رہا تھا اس شخص کے منہ سے نکلنے والے لفظوں کا۔

''بہت...... برف...... تھی...... تھی وہاں...... پہ۔'' اس نے لڑکھڑاتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ''کبھی یک دم...... پیروں کے نیچے سے زمین غائب ہو جاتی...... نہیں برف غائب ہو جاتی...... پھر پتا بھی نہیں چلتا تھا...... کہ...... کہ......'' وہ اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ ایک بار پھر وہ اسی طرح خلا میں گھورنے لگا۔ کمپیئر نے مداخلت کی۔

''آپ پہلے فوجیوں میں سے ایک تھے؟''

''جی۔''

''کیا مشکلات پیش آئیں آپ کو وہاں بھجوائے جانے...... پر...... خاص طور پر تب جب آپ کے پاس آج جیسی سہولیات بھی نہیں تھیں؟''

''کوئی مشکلات پیش نہیں آئیں۔'' کریم بخش نے یک دم کسی مشین کی طرح کہا۔

''جذبہ تھا ہم میں...... ہم لڑنے گئے تھے وہاں۔''

میں اب اس آدمی کے لہجے کو پہچان سکتا تھا کسی مشین کی طرح اب وہ، وہ باتیں کہہ رہا تھا جو طوطے کی طرح رٹائی جاتی ہیں۔ وہ سامنے بیٹھے اتنے جنرلز کے سامنے اس خوف کا اظہار نہیں کر پا رہا ہو گا جس کا شکار وہ پہلی دفعہ وہاں آ کر ہوا ہو گا...... میں جانتا تھا، میں محسوس کر سکتا تھا...... اس کی تنہائی کو...... اس کے خوف کو......

''مگر پھر بھی کچھ تو مسائل پیش آئے ہوں گے آپ کو؟'' کمپیئر نے اصرار کیا۔

''ہاں تھوڑے بہت مسائل پیش آئے تھے...... وہاں کچھ بھی نہیں تھا...... ہم نیچے سے 20 لوگ اوپر جانے کے لیے چلے تھے مگر وہاں صرف تین پہنچے تھے۔''

کریم بخش ایک بار پھر جیسے کسی ٹرانس میں چلا گیا۔ ''رستے میں پتا نہیں چلتا تھا...... کون کہاں گیا...... کون

کہاں پھسل گیا...... ہم ایک دوسرے کے ساتھ رسی باندھ کر چلتے تھے پھر بھی...... وہاں برف سے ڈھکی ہوئی کھائیاں تھیں۔ ہم ایک دوسرے کو بچا بھی نہیں سکتے تھے۔

پہلی رو میں بیٹھے ہوئے ایک افسر نے جماہی لی...... شو کچھ زیادہ ہی لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ابھی ایک پارٹی میں بھی شرکت کرنی تھی اور وہاں کا ماحول یقیناً یہاں کے ماحول کی طرح sombre نہیں ہوگا۔ اس نے قدرے بیزاری کے ساتھ سوچا۔ ''اب ان جنرلز کی وجہ سے میں اٹھ کر جا بھی نہیں سکتا۔ اور اوپر سے یہ فضول آدمی اتنے لمبے لمبے pause لے رہا ہے...... اس کو چاہیے جلدی بات ختم کرے۔'' وہ بیزاری سے اسٹیج کو دیکھنے لگا۔

''آپ کے چہرے پر یہ جو نشانات ہیں یہ کس چیز کی وجہ سے ہیں؟'' کمپیئر اب اس آدمی سے پوچھ رہا تھا۔

کریم بخش نے بے اختیار اپنی ناک کو چھوا۔ ''برف سے جل گیا تھا میں......''

''فراسٹ بائٹ۔'' میں نے زیر لب دہرایا۔ دو دن پہلے میں اس کا شکار ہوا تھا جب میں اوندھے منہ برف پر گرا تھا اور......

''میں خوش قسمت تھا میرے ہاتھ اور پیروں کی صرف تمام انگلیاں ہی کاٹنی پڑیں...... باقی بہت سے ساتھیوں کی ٹانگیں اور بازو بھی کاٹنے پڑے۔'' کریم بخش نے دسیوں انگلیوں سے محروم اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

''اب ختم بھی کریں یہ انٹرویو...... پتا نہیں...... ابرار کو کب بلائیں گے...... میں اس کے گانے سننے کے لیے آیا ہوں اور یہ اسے بلا ہی نہیں رہے۔'' ہال کی ایک نشست پر بیٹھے ہوئے ایک ٹین ایجر نے اپنے دوست سے بیزاری کے ساتھ کہا۔

''میں خود شاہدہ منی کے انتظار میں بیٹھا ہوں...... پہلے گانا گوانا چاہیے تھا اس سے۔'' اس کے دوست نے کہا۔ ''بہت بور فنکشن ہے۔ مجھے پتا ہوتا تو میں نہ آتا۔'' پہلے ٹین ایجر نے کہا۔

''بہت سے ساتھیوں کی تو لاشیں بھی واپس نہیں لا سکے...... وہ مل ہی نہیں سکیں۔'' کریم بخش کہہ رہا تھا......

مجھے ان چھ لاشوں کا خیال آیا جو اس وقت برف کی دبیز تہ میں دب چکی ہوں گی...... ان میں سے بھی شاید ہی کسی کو واپس بھیجا جا سکے...... یہ واقعی برف کا قبرستان ہے...... میں نے ایک جھرجھری سی لی...... ریڈیو سے اب کریم بخش کی آواز کے بیک گراؤنڈ میں بھی دبی دبی آوازیں ابھر رہی تھیں...... وہ مائیکروفون جو ہال میں تالیوں کی آواز کو capture کرنے کے لیے نصب کیے گئے تھے۔ وہ ہال میں موجود حاضرین کی سرگوشیوں کو بھی transmit کر رہے تھے۔

''اچھا کریم بخش صاحب آپ کو کبھی افسوس ہوا، اپنی انگلیوں کے ضائع ہونے پر؟'' کمپیئر نے کریم بخش سے پوچھا۔

''نہیں کبھی نہیں...... میں نے یہ قوم کے لیے قربان کی تھیں...... قوم کے مستقبل کے لیے...... کل آنے والے بچوں کے لیے...... افسوس کیوں ہوتا مجھے؟'' ہال میں اس کی گفتگو کے دوران پہلی بار تالیاں گونجیں......

کریم بخش نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس نے کمپیئر کو سانس اور جلد کی ان بیماریوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا جن کا شکار وہ پچھلے سولہ سال سے چلا آ رہا تھا۔ فوج سے اس کی جلد ریٹائرمنٹ کی وجہ بھی یہی تھی...... مگر اس نے کبھی

اپنی بیماریوں کا ذمہ دار فوج اور سیاچن کو نہیں گردانا تھا......

''میں نہیں جاتا کوئی اور جاتا...... مگر کسی نہ کسی کو تو وہاں جانا ہی تھا...... اور جو بھی جاتا اس کے ساتھ یہی ہوتا...... پھر میں کیا کہوں کہ یہ میرے ساتھ کیوں ہوا...... میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو ان لوگوں کے لیے وہاں بنیادیں فراہم کی تھیں...... جو آج وہاں ہیں...... بنیاد کا پتھر بنے تھے ہم...... ہم پر کتنا بوجھ پڑا۔ کیا معنی رکھتا ہے اس احساس کے سامنے کہ ہم نے جو کچھ کیا، قوم کے لیے کیا۔'' کریم بخش نے ستارۂ جرأت کو چھوتے ہوئے سوچا تھا۔

''کریم بخش صاحب! آپ نوجوان نسل کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟'' کمپیئر اب کریم بخش سے پوچھ رہا تھا۔ میں بیک گراؤنڈ میں ابھرنے والی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ ناراضی کی ایک لہر سی میں نے اپنے اندر اٹھتی محسوس کی۔ کیا ہال میں بیٹھے ہوئے ان لوگوں کو احساس نہیں ہے کہ یہ ایک قومی ہیرو کی چند منٹوں پر مشتمل گفتگو خاموشی سے سن سکیں...... وہ قومی ہیرو جو سیاچن کی پاگل کر دینے والی خاموشی اور تنہائی کا سامنا صرف ان لوگوں کے لیے کرتا ہے۔

''میرا پیغام یہ ہے کہ۔'' وہ ایک بار پھر رک گیا تھا۔ ہال میں ایک بار پھر سرگوشیاں ابھریں...... میں ہمہ تن گوش اس شخص کی بات سننے کے لیے بیٹھا تھا اور مجھے ابھرنے والی ان آوازوں پر غصہ آ رہا تھا۔ جن کی وجہ سے میرے لیے کریم بخش کی بات سننا مشکل ہو رہا تھا۔

''دیکھیں......'' کریم بخش نے گلا صاف کیا۔ ''میں کوئی...... کوئی...... بہت...... پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔'' اس نے اٹکتے ہوئے بات شروع کی۔

''مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا...... مگر کچھ حالات کی وجہ سے میں زیادہ نہیں پڑھ سکا......'' وہ رکا۔

کمپیئر نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کی...... خاتون کمپیئر نے اپنے تراشیدہ کھلے بالوں میں ایک بار ہاتھ پھیرا...... دونوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کریم بخش جواب دیتے ہوئے ٹریک سے اتر گیا تھا اور اب دونوں ایک دوسرے کو ایک لحظہ کے لیے دیکھتے ہوئے طے کر رہے تھے کہ مداخلت کون کرے گا۔

''ساری عمر مجھے اس کا بڑا افسوس رہا...... مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ میں خوش قسمت ہوں جو زیادہ نہیں پڑھا...... شاید زیادہ پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے میں اس ملک اور قوم سے اندھی محبت کرتا ہوں۔ زیادہ پڑھ لکھ جاتا تو آج یہاں بیٹھ کر ملک میں کیڑے نکال رہا ہوتا۔'' میری آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیرنے لگی۔

''میں کوئی بڑا امیر آدمی نہیں ہوں...... چند مربع زمین ملی تھی مجھے جس پر میں اپنے بیٹوں کے ساتھ کاشت کاری کرتا ہوں۔''

مرد کمپیئر کے کان میں اڑسے ہوئے ننھے سے ہیڈ فون میں پروگرام پروڈیوسر کی آواز گونجی۔

''ایک منٹ کے بعد بات کاٹ دینا اور اس بار انٹرویو کو وائنڈ اپ کر دینا...... نیکسٹ اینٹری......'' آواز بند ہو گئی۔

''مگر میں پھر بھی مطمئن ہوں...... وطن کے لیے کچھ قربان کر دینے سے وطن کا قرض نہیں اترتا...... مجھے اگر افسوس ہے تو صرف یہی کہ میں غازی بنا شہید نہیں...... اور...... اور مجھے اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر کہ میں نے وطن

سے نمک حرامی نہیں کی۔ میری نوجوان نسل سے یہی درخواست ہے کہ اس ملک کی قدر کریں۔"

کریم بخش اب خاموش ہو گیا تھا۔

"آپ نے بہت اچھا پیغام دیا، ہم یقیناً اس ملک کی قدر کریں گے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔" کمپیئر نے قدرے جلد بازی کے انداز میں انٹرویو کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔

میں ریڈیو سے گونجنے والی ان تالیوں کی ہلکی سی آواز کو سن رہا تھا جو کریم بخش کے جانے پر بجائی جا رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ سے میں نے اپنی آنکھوں میں اترنے والی نمی کو صاف کیا۔ شاید آج سے دس پندرہ سال بعد میں بھی ایسے ہی کسی پروگرام میں یہی ساری باتیں دہرا رہا ہوں گا۔ وطن سے محبت کی...... نمک حلالی کی...... اور شاید یہاں کوئی اسی طرح ریڈیو پر بیٹھا یہ سب سن رہا ہوگا۔

"جی ظفر...... اب پروگرام میں آگے کیا ہے؟" خاتون کمپیئر، مرد کمپیئر سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ تو حاضرین سے پوچھنا چاہیے۔" مرد کمپیئر نے کہا۔

"ان سے پوچھ لیتے ہیں...... اگلے مہمان کو بلایا جائے یا پھر کسی سنگر کو؟" کمپیئر اب حاضرین سے پوچھ رہا تھا۔

"نو انٹرویو...... نو گیسٹ...... سنگر...... سنگر......" ریڈیو سے گونجنے والی آوازیں بہت نمایاں تھیں۔

ایک لمحہ کے لیے مجھے اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہوا۔ سنگر...... سنگر چلانے والے ان لوگوں کو کیا یہ پتا ہے کہ اس وقت بھی ان کے اس عیش و آرام کے لیے کوئی کہاں کہاں بیٹھا ہے۔

"تو ٹھیک ہے، ہم ابرار الحق کو دوبارہ بلاتے ہیں...... پچھلی بار انھوں نے ملی نغمہ سنایا تھا...... اس بار ہم ان سے ان کا ہٹ سونگ اساں تے جاناں مال و مال سنتے ہیں۔"

کمپیئر کے کہنے پر ہال میں تالیوں کی آواز گونج اٹھی تھی...... تالیوں اور سیٹیوں کا اتنا شور تھا کہ مجھے ریڈیو کا والیم قدرے کم کرنا پڑا۔ مجھے وہ تالیاں یاد آئیں جو ان لوگوں نے کریم بخش کی آمد پر بجائی تھیں۔

گلوکار اب اپنا گانا شروع کر چکا تھا۔ میں تصور کی آنکھ سے ہال میں بیٹھے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کو ناچتے ہوئے دیکھ سکتا تھا...... برگر کلاس کے برمودا شارٹس اور جینز میں ملبوس لڑکے اور لڑکیاں......

"ہاتھ اٹھا کر...... سب مل کر......" ابرار الحق اب ہدایات دے رہا تھا...... میں نے خون آلود دستانے میں چھپا ہوا بایاں ہاتھ اٹھا کر دیکھا...... اڑتالیس گھنٹوں میں پہلی بار مجھے اس ہاتھ کے زخمی ہونے پر افسوس ہوا اور یہ تصور کر کے تکلیف کہ اسے علیحدہ کر دیا جائے گا۔

"اساں تیری گل کرنی...... گل کرنی اے ڈیڈی نال، اساں تیری گل کرنی۔" گلوکار لہک لہک کر گا رہا تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے زندگی میں پہلی بار میں نے سوچا...... کیا ضروری تھا میں فوج میں آتا...... اور اس قوم کے لیے ان پہاڑوں پر اپنے جسم کے حصوں کو باری باری خود سے جدا ہوتے دیکھتا، ضائع کرتا۔ جو یہ بھی نہیں جانتی کہ شہید یا غازی کا احترام کیا ہوتا ہے...... میری عمر کے بہت سے لڑکے ابھی تعلیم حاصل کر رہے ہوں گے...... یونیورسٹیز میں، کالجز میں...... بیرون ملک...... اور میں چوبیس سال کی عمر میں اگلے کچھ دنوں کے بعد اپنا ہاتھ کٹوا کر ترقی کی ریس سے

باہر ہو جاؤں گا...... کس کے لیے؟

. ان لوگوں کے لیے جو غازیوں کے بجائے گلوکاروں کو اہمیت دیتے ہیں...... جو ہم سے یہ تک سننے کے لیے ہمیں چند منٹ نہیں دے سکتے کہ ہم نے موت کو کہاں سے کس طرح جا کر دیکھا...... صرف اس لیے کہ ملک کے اندر بیٹھے ہوئے ان لوگوں کے عیش و آرام پر کوئی حرف نہ آئے۔ بیس سال بعد جب میں بھی ایسے کسی اسٹیج پر یہ بتانے جاؤں کہ میرے سینے پر ہاتھ کٹوا کر سجایا جانے والا تمغہ میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے...... تو شاید میں بھی کریم بخش کی طرح بات کرتے ہوئے لڑکھڑاؤں گا...... اور شاید میرے انٹرویو کے بعد بھی حاضرین اگلے کسی مہمان کے بجائے کسی سنگر کو بلوانے کی فرمائش کریں گے تاکہ اس بوریت کا سدباب ہو سکے جو انہیں پچھلے چند منٹوں کے دوران برداشت کرنی پڑی۔ میں کیوں پاکستان کی ان آنے والی نسلوں کے لیے اپنا حال قربان کروں، جن کے لیے ہر چیز گانے سے شروع ہو کر ناچنے پر ختم ہو جاتی ہے۔ جن کے لیے ہر اہم تہوار چھٹی کا ایک اور دن اور ایک اور میوزیکل ایوننگ سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوتا...... اور وہ انسان پاگل ہیں جو رات کی اس تاریکی میں اندھوں کی طرح چھڑیوں سے، کھائیاں ٹٹولتے...... ہڈیوں میں اتر جانے والی اس سردی میں کئی گھنٹوں کا سفر کر کے یہاں پہنچیں گے...... پہنچیں گے بھی یا نہیں۔

اور اس ہیلی کاپٹر کے پائلٹ بھی پاگل ہیں جو اپنے پروفیشنل سرٹیفکیٹس اور ڈگریوں کے ساتھ عقل کو بھی بھاڑ میں جھونکتے ہوئے ان لوگوں کو ان پہاڑوں میں اتارنے کے لیے چل پڑیں گے...... شہادت کی صورت میں انہیں ایک اور ستارۂ جرأت مل جائے گا زندہ رہنے پر ایسے کسی شو میں شرکت کا دعوت نامہ بھی...... اور بس زندہ قومیں اپنے شہیدوں اور غازیوں کی قربانیوں کو بھلاتی نہیں ہیں...... مگر ان کے پاس ان قربانیوں کے لیے عزت نہیں ہوتی...... میرا دل چاہ رہا ہے، میں اب یہاں سے بھاگ جاؤں۔

پہلی بار میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں...... میں یہاں ان لوگوں کے لیے......

وائرلیس پر میرے لیے کوئی پیغام آ رہا ہے...... میں نے وائرلیس آن کیا۔

''مورال کیسا ہے کیپٹن ولید؟'' دوسری طرف سے میرے CO نے کہا "skyhigh sir" (آسمان سے اونچا) پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں چودہ دفعہ میں نے یہ کہا تھا۔ مگر اس بار میں کچھ بھی نہیں بول سکا تھا۔

''مورال کیسا ہے؟'' انھوں نے ایک بار پھر دہرایا۔

''مورال؟'' میں بڑبڑایا۔

''کس کو بلائیں اگلے مہمان کو یا سنگر کو؟'' ''نو انٹرویو...... نو گیسٹ...... سنگر...... سنگر......''

''مورال کیسا ہے کیپٹن ولید؟''

''مورال۔'' میں پھر بڑبڑایا۔

''پتا نہیں سر۔'' میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

❁......❁......❁